OPEN ACCESS: "*EPISTEMOLOGY"*
eISSN: 2663-5828;pISSN: 2519-6480
Vol.9 Issue 10 December 2021

قرآنی آیات میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر کے بلاغی اسباب وحِکم

RHETORICAL CAUSES AND RULES FOR PRECEDENCE AND DELAY OF WORDS IN QUR'NIC VERSES

Shafiq ur Rehman
Research Scholar, Sheikh Zayed Islamic Centre, University of the Punjab, Lahore.

Dr. Hafiz Abdul Qayyum
Associate Professor, Sheikh Zayed Islamic Centre, University of the Punjab, Lahore..

Abstract: A Characteristic of the Arabic language is the possibility of fronting and pre-posing the sentence elements. It enables the speaker or writer to front whatever he/she wishes for the purpose of meaning or order of importance or chronological order. Fronting and pre-posing are found in both grammar and rhetoric. Being a text, the Holy Quran follows the linguistic conventions and has also demonstrated the principle of fronting and pre-posing. In the Holy Quran, where the style of fronting and pre-posing is adopted, having many benefits i.e. to make excellent the sentence structure and to intent the conception on any specific meaning in this regard. So after adopting this style ,it is not possible to be useless regarding the textual and meaningful benefits. Without achieving these benefits, the style of fronting and pre-posing in a sentence will be useless. Moreover it will create difficulties and complications for the reader and listener .Finally, we can say that any such eloquent language can't face with these demerits. To keep in view this realty, we can also say that the Holy Quran is free from such errors due to have highest rank in the series of world books.

Keywords:- Fronting and Pre-posing, Grammar and Rhetoric, Conception on Specific meaning, Textual and meaningful benefits.

قرآن کریم کے وجوہ اعجاز کا ایک غیر معمولی پہلو کلام کی مختلف احتمالی ترکیبات میں سے ایسی عمدہ ترکیب کا انتخاب ہے جو کہ سیاق وسباق کے مناسب اور مذاق سلیم کے لیے موجب فرحت وانبساط ہوتی ہے۔الفاظ کا یہ بلیغ جوڑ مقصد و مطلب کا مکمل عکاس اور حقائق ومعارف کو اس انداز میں بیان کر رہا ہوتا ہے کہ منصوص صورت کے علاوہ ترکیب کی کوئی اور شکل اُن نکات وحکم کی حامل نہیں ہو سکتی۔اِس لیے کہ یہ ایک مسلمہ اَمر ہے کہ کلام لفظی اُن معانی کی ایک ظاہری شکل ہوتی ہے جو کہ متکلم کے ذہن میں ہوتے ہیں اور یہ اَمر بھی بالکل واضح ہے کہ متکلم کی ذہنی کیفیات، مخاطب کی نفسیات اور محل کلام کے احوال ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے، لہذا مذکورہ اُمور کو سامنے رکھتے ہوئے متکلم جب مختلف مواقع پر کلمات کو ترکیبی شکل میں ڈھالتا ہے تو یقیناً عناصر کلام کی ظاہری شکل کے پس منظر میں موجود معانی ترکیب کلام پر اَثر انداز ہوتے ہیں۔اِسی لیے علماء بلاغت کلام کی جہات ترکیبیہ و ترتیبیہ کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں کیونکہ جہاں کلام کا ظاہری ڈھانچہ ایک محکم مفہوم کو اَدا کر رہا ہوتا ہے وہاں عناصر کلام کی ترکیبی ترتیب وہیت بھی اسرار ورموز اور علم وحکمت کے خزینوں سے لبریز ہوتی ہے۔

اَسباب وحِکم

متکلم اپنے مافی الضمیر کو مخاطب تک پہنچانے کے لیے لفظوں کا سہارا لیتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ کلام نفسی کی تعبیر کے لیے مختلف اجزاء کو ایک لڑی میں پروتا ہے۔سو مختلف اجزائے کلام کو ایک ترکیب میں جوڑتے ہوئے وہ کسی جز کو ذکر میں پہلے لاتا ہے اور کسی کو قصداً مؤخر کر دیتا ہے۔ایک فصیح متکلم کا اجزائے کلام کو یکے بعد دیگرے ایک ترتیب سے ترکیب میں جوڑنے کا یہ عمل یقیناً مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔قرآن کریم بھی چونکہ ایک مجموعہ کلام ہے جس میں خالق کائنات نے بندوں کی زبان میں بندوں سے کلام کیا ہے اور یہ فصاحت وبلاغت کا ایسا مجموعہ ہے کہ جس کی نظیر پیش کرنا انسانی بساط میں نہیں۔قرآنی بلاغت کی مختلف وجوہ میں سے ایک وجہ اور طرز الفاظ کلام کی طبعی نشست میں تبدیلی کا عمل بھی ہے۔قرآن چونکہ ملوک الکلام ہے لہذا اِس کے الفاظ کا انتخاب اور پھر اُن کی بطور جز جملہ ترتیب لطائف وحِکم سے پھرپور ہوتی ہے اور خاص طور پر جب جملہ کو تشکیل دیتے ہوئے الفاظ کو لانے میں عمومی ترتیب کو چھوڑ کر خصوصی طرز کو اختیار کیا جاتا ہے تو یہ اُسلوب اور بھی غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔عناصر کلام کی ترتیب میں تبدیلی کا یہ اُسلوب اہل بلاغت کی خاص دلچسپی کا موضوع رہا ہے۔علماء بلاغت نے مذکورہ طرز پر مشتمل قرآنی جمل میں غور وخوض کرتے ہوئے چند

ایسے بلاغی اسباب وفوائد کی نشاندہی کی ہے کہ جن کے سبب کلام میں تقدیم وتاخیر کے اُسلوب کو اختیار کیا جاتا ہے۔اِن فوائد و حِکم کا مختصر احوال کچھ اِس طرح سے ہے۔

سبقت:

علماء بلاغت نے قرآن مجید میں الفاظ کی تقدیم وتاخیر کا ایک سبب ''سبقت''یعنی پہلے ہونا کو بیان کیا ہے۔اَب یہ سبقت کئی طرح سے ہو سکتی ہے۔

ا۔زمانہ ایجاد کے اعتبار سے

وہ چیز جو زمانی وجود کے اعتبار سے مقدم ہو،اُسے ذکر میں بھی مقدم رکھا جائے۔جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ][1]

''اُسے نہ اونگھ آسکتی ہے اور نہ نیند''

یہ جملہ قرآن کریم کی اُس عظیم ترین آیت کا حصہ ہے جسے احادیث میں آیۃ الکرسی اور سیدۃ آیات القرآن کا نام دیا گیا ہے۔اِس آیت میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات وصفات کا تعارف انتہائی خوبصورت انداز میں کروایا گیا ہے کہ وہ ذات یکتا،بے مثل اور بے نظیر ہے اُس جیسا کوئی نہیں۔وہ حیّ اور قیوم ہے وہ ایسی ہستی ہے جو اُونگھ اور نیند سے پاک ہے۔اُونگھ سے مراد وہ آثار ہیں جو نیند سے پہلے ظاہر ہوتے ہیں جبکہ نوم مکمل نیند کو کہتے ہیں۔آیت کے قوت بیان کا تقاضہ تو یہی تھا کہ پہلے نیند کا ذکر کیا جاتا کہ وہ ایسی ذات ہے جسے نیند نہیں آتی،نیند تو نیند رہی اُسے اُونگھ بھی نہیں آتی، لیکن یہاں قرآن مجید نے اونگھ اور نیند جیسے حیوانی اوصاف کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات سے نفی کرتے ہوئے لفظ سنۃ کو نوم سے مقدم رکھا ہے۔اس لیے کے اونگھ کا وقوع نوم سے پہلے ہوتا ہے،لہذا اِس وجودی ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے اُونگھ کو نیند سے ذکر میں پہلے رکھا گیا ہے۔

قاضی ثناءاللہ پانی پتی(م:۱۲۲۵ھ)لفظ سنۃ کی نوم پر تقدیم کے بلاغی سبب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''[لا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلا نَوْمٌ السنة] فتور يتقدم النوم في الوجود ولذا قدم ذكره مع ان قياس المبالغة يقتضى العكس- والنوم حالة تعرض الحيوان من استرخاء أعضاء الدماغ من رطوبات الابخرة المتصاعدة بحيث يعطل الحواس الظاهرة عن الاحساس رأسا- وهذه الجملة صفة سلبية ينفى التشبيه فهى تأكيد لكونه حيا قيوما فانه من

اخذه نعاس او نوم كان ما دون الحيوة فان النوم أخ الموت قاصرا في حفظ الأشياء وقيوميتها ولذالك تركالعاطف."[2]

''(اُسے نہ اُونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند)اُونگھ چونکہ وجود میں نیند سے پہلے ہے اس لیے اُسے ذکر میں بھی پہلے لایا گیا ہے باوجود اِس بات کے کہ قوت بیان کا تقاضہ اس کے برعکس تھا۔ نیند سے مراد وہ حالت ہے جو مرطوب بخارات کے چڑھنے سے دماغی اعصاب میں پیدا ہوتی ہے جس کے سبب اعضاء ڈھیلے پڑ جاتے ہیں اور وہ بیرونی احساس سے محروم ہو جاتے ہیں جبکہ اُونگھ نیند سے پہلے ظاہر ہونے والے آثار کا نام ہے۔اور یہ جملہ صفت سلبیہ کا اظہار ہے جو مخلوق سے مشابہت کی نفی کر رہا ہے گویا یہ حیّ وقیوم ہونے کی دلیل ہے اِس لیے کہ جسے اُونگھ اور نیند آتی ہو اُس کا بیرونی نظام زندگی درست نہیں رہے سکتا اور وہ اشیاء کی نگہبانی اور حفاظت کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے اِسی وجہ سے ''القیوم ''اور ''لاتاخذہ'' کے درمیان حرف عطف کو نہیں لایا گیا''

۲۔زمانہ نزول کے اعتبار سے

قرآن پاک نے سابقہ صحائف وکتب کا تذکرہ کرتے ہوئے عمومی طور پر اُن کتب کے زمانہ نزول کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اَلاول فالاول کا اُسلوب اپنایا ہے۔

[صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى][3]

''ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں''

اِس آیت کے سیاق وسباق میں چند ایسے احکام بیان ہوئے ہیں جو کہ صحیفہ ابراھیمی وموسوی کی مشترکہ تعلیمات رہی ہیں۔ یہ آیت اَب اُن احکام کا صحف سابقہ میں مذکور ہونے کو بیان کر رہی ہے۔آیت میں الفاظ کی ترتیب کچھ اس طرح سے ہے کہ صحیفہ ابراھیمی کا تذکرہ پہلے اور صحیفہ موسوی کا بعد میں ہے۔ علامہ ابن عاشور (م:۱۳۹۳ھ) صحف سابقہ کے تذکرہ پر مشتمل اِس جملہ کی ترکیبی ترتیب کا سبب اُن کے زمانہ نزول کو قرار دیتے ہیں۔ سو جو کتاب نزول زمانہ کے اعتبار سے پہلے ہے وہ ذکر میں بھی مقدم ہے اور جو زمانہ کے لحاظ سے مؤخر ہے وہ ترتیبی اور ترکیبی لحاظ سے بھی مؤخر ہے۔ جیسا کہ موصوف فرماتے ہیں:

"وَإِنَّمَا قُدِّمَ فِي سُورَةِ الْأَعْلَى صُحُفُ إِبْرَاهِيمَ عَلَى صُحُفِ مُوسَى مُرَاعَاةً لِوُقُوعِهِمَا بَدَلًا مِنَ الصُّحُفِ الْأُولَى فَقَدَّمَ فِي الذِّكَرِ أَقْدَمَهُمَا. "[4]

۳۔تکلیف کے لحاظ سے

ادائیگی اُمر میں سبقت کے اعتبار کی ایک مثال صفا و مروہ کی سعی ہے۔قرآن کریم نے دین الٰہی کے شعائر کے طور پر صفا و مروہ کا ذکر کرتے ہوئے صفا کے تذکرہ کو مروہ پر مقدم رکھا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ][5]

"بیشک صفااور مروہ اللہ تعالیٰ کی یادگاروں میں سے ہیں"

ترتیب جملہ میں صفا کا ذکر چونکہ پہلے ہے لہذا بعض علماء تو اس ترتیبی تقدیم کو صفا سے سعی کی ابتدا کرنے کے وجوب پر دلیل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ احناف دلالت تقدیم کو وجوب کی دلیل تو نہیں مانتے، البتہ صفا سے آغاز کو وہ بھی سنت قرار دیتے ہیں، جیسا کہ امام جصاص (م:۳۷۰ھ) حنفی موقف کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّفَا حَتَّى بَدَا لَهُ الْبَيْتُ فَقَالَ نَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِيَدُلُّ عَلَى أَنَّ لَفْظَ الْآيَةِ لَا يَقْتَضِي التَّرْتِيبَ إذْ لَوْ كَانَ ذَلِكَ مَعْقُولًا مِنْ الْآيَةِ لَمْ يَحْتَجْ أَنْ يَقُولَ نَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِ فَإِنَّمَا بدئ بالصفا قبل المروةلقوله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللَّهُ بِهِوَنَفْعَلُهُ كَذَلِكَ مَعَقَوْلِهِ [خُذُوا عَنِّيمَنَاسِكَكُمْ]وَلَا خِلَافَ بَيْنَ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّ الْمَسْنُونَ عَلَى التَّرْتِيبِ أَنْ يَبْدَأَ بِالصَّفَا قَبْلَ الْمَرْوَة فَإِنْ بَدَأَ بِالْمَرْوَةِ قَبْلَ الصَّفَا لَمْ يُعْتَدَّ بِذَلِكَ فِي الرِّوَايَةِ الْمَشْهُورَةِ عَنْ أَصْحَابِنَا وَرُوِيَ عَنْ أَبِي حَنِيفَةَ أَنَّهُ يَنْبَغِي لَهُ أَنْ يُعِيدَ ذَلِكَ الشَّوْطَ فَإِنْ لَمْ يَفْعَلْ فَلَا شَيْءَ عَلَيْهِ وَجَعَلَهُ بِمَنْزِلَةِ تَرْكِ التَّرْتِيبِ فِي أَعْضَاءِ الطَّهَارَةِ ."[6]

"پھر آپ ﷺ صفا کی طرف نکلے یہاں تک کہ بیت اللہ آپ کے سامنے ظاہر ہو گیا پس آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم وہیں سے شروع کریں گے جہاں سے اللہ تعالیٰ نے شروع فرمایا، اِن الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آیت کے یہ الفاظ ترتیب پر دلالت نہیں کرتے اس لیے کہ اگر الفاظ آیت سے ترتیب سمجھ آ رہی ہوتی تو آپ ﷺ یہ بالکل نہ فرماتے کہ ہم وہاں سے شروع کریں گے جہاں سے اللہ نے شروع کیا تو گویا صفا سے ابتدا آپؐ کے اس فرمان کے سبب ہوئی کہ ہم وہیں سے ابتدا کرتے ہیں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے ابتدا فرمائی اور ہم ایسا آپ ﷺ کے اس فرمان کے سبب کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا

کہ آپ لوگ مجھ سے حج کے طریقے سیکھ لو، لہذا اہل علم کا صفا سے سعی کی ابتدا کے سنت ہونے پر اتفاق ہے پس اگر کوئی صفا کی بجائے مروہ سے آغاز کرے گا تو اس کے ایسے پھیرے کو شمار نہیں کیا جائے گا، ہمارے اصحاب سے مشہور روایت یہی ہے اور امام ابو حنیفہ سے منقول ہے کہ مناسب یہ ہے کہ وہ اس پھیرے کا اعادہ کرے پس اگر وہ اعادہ نہیں کرے گا تو اس پر کفارہ لازم نہیں ہو گا پس امام صاحب اس ترتیب کو اعضاء طہارت کی ترتیب کے مترادف قرار دیتے ہیں"

علامہ جصاص کی عبارت سے جو مفہوم اَخذ ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ کسی لفظ کا ترتیب کلام میں پہلے ذکر ہونا اُس اَمر کے وجوب کی دلیل نہیں ہو سکتا، اِسی لیے احناف سعی کے صفا سے آغاز کو وجوب کی بجائے سنت پر محمول کرتے ہیں۔

۴۔ ذات کے اعتبار سے

یعنی جو اَمر ذاتاً مقدم ہو اُسے ذکر میں بھی مقدم لایا جائے، جیسا کہ قرآن کریم نے اعداد کے باب میں اس پہلو کا لحاظ رکھا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اعداد کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اُن کا ہر ایک عدد مرتبہ میں اپنے مافوق پر بالذات مقدم ہوتا ہے لہذا اِسی ذاتی تقدم کا لحاظ رکھتے ہوئے قرآن نے بھی اعداد کے بیان میں اسی ترتیب کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

[فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ][7]

"جو عورتیں تمہیں پسند ہوں اُن سے نکاح کر لو دو دو سے خواہ تین تین سے خواہ چار چار سے"

خوش خبری دینے میں جلدی کرنا

ہمارے عرف میں بھی یہ بات مشاہدہ میں آتی رہتی ہے کہ جب متکلم مخاطب کو کسی اَمر مہم پر مبارک باد پیش کرتا ہے تو وہ عموماً خوش خبری کے معنیٰ پر مشتمل الفاظ کو ترکیب جملہ میں پہلے لے آتا ہے، جیسا کہ قائل سامنے والے سے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ آپ کو مبارک ہو، آپ کامیاب قرار پائے ہیں۔ عربی زبان میں اسے "مبروک انت ناجح" کے اَلفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس اُسلوب کو اختیار کرتے ہوئے الفاظ تھنیۃ کو ترکیب جملہ میں مقدم رکھا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[عَفَا اللَّهُ عَنْكَ لِمَ أَذِنْتَ لَهُمْ][8]

"اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف کر دیا (لیکن) آپ نے اُن کو اجازت کیوں دے دی تھی"

غزوہ تبوک کے موقع پر کچھ منافقین نے حیلے اور بہانے سے آپ ﷺ سے غزوہ میں نہ جانے کی اجازت مانگی۔ آپ ﷺ نے اُن کے جھوٹے بہانوں کو مبنی بر حقیقت خیال کرتے انہیں اجازت عنایت فرمادی۔اس اجازت سے ایک طرف تو منافقین کے نفاق پر پردہ پڑ گیا کہ وہ بلا اجازت نہیں بلکہ رخصت لے کر شرکت نہیں کر رہے۔ جبکہ اُمر واقع یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ اجازت نہ دیتے تو بھی انہوں نے جنگ میں شرکت نہیں کرنا تھی البتہ اجازت نہ دینے کا فائدہ یہ ہونا تھا کہ ایک طرف اس سے اُن کا نفاق ظاہر ہو جاتا تو دوسری طرف انہیں یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چال چلی ہے اور خدانخواستہ آپ ﷺ اُن کے فریب میں آ گے ہیں۔ بہر حال آپ ﷺ کی طرف سے منافقین کو اجازت دینے کا یہ عمل اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ہاں پسندیدہ قرار نہ پایا۔ چنانچہ اس خلاف اولیٰ فیصلہ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بڑے لطیف انداز میں تنبیہ فرمائی گی ہے اور اس تنبیہ پر مشتمل ترکیب کو اس طرز اور اُسلوب میں رکھا گیا ہے کہ اظہار عتاب سے پہلے عفو اور معافی کا ذکر ہے تاکہ آپ ﷺ کو تسلی اور اطمینان رہے۔ شکایت پر معافی کے مقدم ہونے کی بلاغی حکمت وسبب کو بیان کرتے ہوئے قاضی ثناءاللہ پانی پتی (م:۱۲۲۵ھ) نقل فرماتے ہیں:

" قال سفيان بن عيينه بدأ بالعفو قبل ان يعيره بالذنب لطفا به وإكراما له قلت او لانه تعالى ذكر العفو قبل المعاتبة تحرزا من ان يهلك رسول الله صلى الله عليه وسلم لكمال خوفه وخشيته من الله تعالى."[9]

"سفیان بن عیینہ بیان کرتے ہیں کہ آیت میں اس سے پہلے کہ شکایت کو بیان کیا جاتا، اُس سے پہلے ہی معافی کا ذکر کر دیا گیا، ایسے اُسلوب کا اپنانا آپ ﷺ پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے کمال مہربانی اور لطف کو ظاہر کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی سے پہلے عتاب کو بیان کر دیا جاتا تو ایسا کرنے سے آپ ﷺ کی جان چلی جاتی اس لیے کہ آپ ﷺ غیر معمولی حد تک اللہ کا خوف اور خشیت رکھتے تھے"

تو گویا آیت میں معافی کی شکایت پر تقدیم آپ ﷺ کو تسلی دینے کی غرض سے ہے۔اس لیے خوشخبری کے مفہوم پر مشتمل الفاظ کو ترتیب کلام میں پہلے رکھا گیا ہے تاکہ وہ شکایت آپ ﷺ کے لیے رنجیدگی اور تکلیف کا باعث نہ بنے۔

بری خبر سے مخاطب کو جلدی باخبر کرنا

عمومی اعتبار سے کلام کا اُسلوب یہ ہوتا ہے کہ جب مخاطب کو کوئی بُری خبر دینا مقصود ہوتی ہے تو اُس خبر کو کلام میں مؤخر رکھتے ہوئے ملفوف انداز میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب کی نفسیات پر اُس خبر کا منفی اَثر نہ ہو۔البتہ جب مخاطب غیر معمولی بگاڑ کا شکار ہو اور جرم کی نوعیت بھی غیر معمولی ہو، تو پھر ایسی صورت میں کلام کے عمومی اُسلوب کو چھوڑ کر خصوصی طرز کو اپنایا جاتا ہے جس کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ جرم کا تذکرہ کرنے سے پہلے اُس پر وارد ہونے والی سزا کو ذکر کر دیا جاتا ہے۔اِس خاص اُسلوب کو اپنانے کا مقصد مجرم کو خوف زدہ کرنا، فعل کی غیر معمولی شناعت کو واضح کرنا اور متاثرہ شخص کی تسلی ہوتا ہے۔،جیسا کہ کہا جاتا ہے "القصاص حكم به القاضی" یعنی جان کے بدلے میں جان لینے کا فیصلہ قاضی نے سنایا ہے۔قرآن کریم نے بھی اس اُسلوب کو متعدد مقامات پر اختیار کیا ہے۔

[فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ][10]

"ہلاکت ہے اُن لوگوں کے لیے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں"

یہ آیت یہود کی طرف سے تورات میں کی جانے والی تحریف کی روش کو بیان کر رہی ہے۔البتہ کلام کا اُسلوب یہ ہے کہ عمل تحریف پر وارد ہونے والی سزا کا ذکر پہلے اور فعل تحریف کا ذکر بعد میں ہے اور اِس طرز کا بظاہر سبب اور حکمت فعل تحریف کی شناعت اور قباحت کو واضح کرنا ہے۔

" الويل: الهلاك وشدة العذاب لِلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتابَ أي المحرّف. أو ما كتبوه من التأويلات الزائفة بِأَيْدِيهِمْ تأكيد لدفع توهم المجاز."[11]

"ویل کے معنٰی ہلاکت اور سخت عذاب کے ہیں یہ عذاب ایسے لوگوں کے لیے ہے جو کتاب میں اپنے ہاتھوں سے ردوبدل کرتے ہیں یا وہ اُس کی من چاہی تاویلات کرتے ہیں، یہاں ایدیہم کا لفظ تاکید کا فائدہ دے رہا ہے اور مجاز کے وہم کو دور کر رہا ہے"

رعایت فواصل

فواصل، فاصلہ کی جمع ہے۔علوم قرآنیہ کی رو سے فاصلہ آیت کے آخری کلمہ کو کہتے ہیں جسے رأس الآیۃ یعنی آیت کا آخری سرا بھی کہا جاتا ہے۔یہ لفظ نثر میں سجع اور شعر میں کافیہ کے قائم مقام ہے کیونکہ سجع اور قافیہ بھی کلام کے آخر میں

ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآنی آیات میں بسا اوقات فاصلہ کی رعایت کی بابت رؤس الآی کو موافق شکل میں لایا جاتا ہے جسے علم فواصل کی اصطلاح میں مشاکلہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شکل کی اس موافقت کو باقی رکھنے کے لیے کبھی آیات میں الفاظ کو مقدم و مؤخر کر دیا جاتا ہے تاکہ اجزائے کلام کے مابین ہم آہنگی اور یکسانیت کلام کی لذت و حلاوت برقرار رہے کیونکہ ذوق سلیم موزوں اور مقفیٰ کلام کی طرف فوری کھنچا چلا آتا ہے۔ فواصل کی رعایت طبائع میں نشاط اور فرحت وانبساط کا موجب بنتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

[قَالَ بَلْ أَلْقُوا فَإِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ إِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ أَنَّهَا تَسْعَى (66) فَأَوْجَسَ فِي نَفْسِهِ خِيفَةً مُوسَى(67) قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَى][12]

''موسیٰ نے کہا کہ تم ہی ڈال چلو پس اچانک اُن کی رسیاں اور اُن کی لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں اُن کے جادو کے زور سے ایسے نظر آنے لگیں کہ گویا وہ دوڑ رہی ہوں۔ اس سے موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ اندیشہ محسوس کیا۔ ہم نے کہا کہ اندیشہ نہ کیجیے یقیناً تم ہی غالب رہو گے''

مقررہ دن پر جب فرعون کی طرف سے بلائے جانے والے جادوگر ایک میدان میں جمع ہو گے تو وہ اپنی بے فکری اور بے پروائی کے اظہار کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہوئے کہ پہلے آپ اپنے عمل کا اظہار کریں گے یا پھر ہم کریں۔ حضرت موسیٰؑ نے مناسب سمجھا کہ پہلے یہ جادوگر اپنے جادو کے کرشمے دیکھا لیں، سو جب وہ اپنے کرشمے دکھا چکے ہوں گے تو پھر آپؑ اپنے معجزے کو ظاہر کریں گے تاکہ حق پوری طرح کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے۔ جادوگروں کی طرف سے جب کرشماتی عمل کا آغاز ہوا تو اس جادوئی عمل کے نتیجہ میں اُن کی طرف سے پھینکی جانے والی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن کر زمین پر دوڑنے لگیں۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے حضرت موسیٰؑ کی طبیعت پر کچھ خوف طاری ہوا کہ اگر یہ مجمع اِس جادو سے مسحور ہو گیا اور اُن پر اس کا رعب طاری ہو گیا تو پھر اُن پر پوری طرح سے اظہار حق نہ ہو پائے گا جو کہ مقصد دعوت کے منافی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دل میں پیدا ہونے والے خوف کو قرآن کریم نے ''فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اَب اس جملہ میں لفظ موسیٰ کو مؤخر لایا گیا ہے حالانکہ ترکیب میں وہ فاعل واقع ہے اور فاعل کی ترکیبی نشست فعل کے بعد بنتی ہے جب کہ یہاں اُسے آیت کے کنارے پر رکھا گیا ہے۔ جملہ میں لفظ موسیٰ کی تاخیر کا سبب فاصلہ کی رعایت ہے، جیسا کہ علامہ زرکشی (م: ۷۹۴ھ) فرماتے ہیں:

"تَأْخِيرُ مَا أَصْلُهُ أَنْ يُقَدَّمَ كَقَوْلِهِ تَعَالَى: {فَأَوْجَسَ فِي نفسه خيفة موسى} لأن أصل الكلام أَنْ يَتَّصِلَ الْفِعْلُ بِفَاعِلِهِ وَيُؤَخَّرَ الْمَفْعُولُ لَكِنْ أُخِّرَ الْفَاعِلُ وَهُوَ مُوسَى لِأَجْلِ رِعَايَةِ الْفَاصِلَةِ "[13]

"اُصل میں جو مقدم ہونا چاہیے اُسے مؤخر کر دیا گیا ہے۔اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا مذکور فرمان ہے (پس موسیٰ نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا)اس لیے کہ اُصل کے لحاظ سے تو فاعل، فعل کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے اور مفعول، فاعل کے بھی بعد آتا ہے لیکن یہاں فاعل یعنی لفظ موسیٰ کو فاصلہ کی رعایت کرتے ہوئے مؤخر کر دیا گیا ہے"

مابعد سے مناسبت

بسااوقات مابعد سے مناسبت کی خاطر ترکیب میں واقع کسی کلمہ کو اپنے اُصل مقام سے ہٹا کر مؤخراً لایا جاتا ہے تاکہ ان کلمات کی مناسبت مخاطب پر واضح ہو سکے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[سَرَابِيلُهُمْ مِنْ قَطِرَانٍ وَتَغْشَى وُجُوهَهُمُ النَّارُ (50) لِيَجْزِيَ اللَّهُ كُلَّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ][14]

"تارکول کے لباس پہنے ہوں گے اور آگ کے شعلے اُن کے چہروں پر چھائے جا رہے ہوں گے۔یہ اس لیے ہو گا کہ اللہ ہر متنفس کو اس کے کیے کا بدلہ دے گا،اللہ کو حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی"

آیت میں مذکور لفظ النار جو کہ ترکیب میں فاعل واقع ہے وہ اپنے مفعول وجوہھم سے مؤخر ہے۔ایسا اِس لیے ہے کہ اس مقام پر النار کے کلمہ کو اپنے مابعد لفظ لیجزی سے جو تعلق و مناسبت ہے اُس کا لحاظ رکھا گیا ہے وہ اس طرح سے کہ مخاطب کفار کے کفر وانکار کی وجہ سے جو جزا بروز قیامت اُن پر جاری ہو گی وہ النار یعنی جہنم کی آگ کی صورت میں ہو گی۔

ماقبل سے مناسبت

کبھی ترکیب کلام میں سابق کی رعایت کرتے ہوئے بھی الفاظ کی ترتیب میں حسب حال تبدیلی کر دی جاتی ہے تاکہ کلام موقع و محل کے مناسب ہو جائے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ][15]

''اور تمہارے لیے اُن میں جمال ہے جب تم شام کو چرا کر لاتے ہو اور صبح چرانے کو لے جاتے ہو''

نزول قرآن کے زمانہ میں عربوں کی معیشت اور گزر بسر کا زیادہ تر حصہ چوپاؤں سے متعلق تھا اس لیے قرآن نے انعام خداوندی کی فہرست میں سب سے پہلے چوپاؤں کا حوالہ دیا ہے۔ عرب چونک مویشیوں سے متعدد فوائد حاصل کرتے تھے چنانچہ انہی فوائد کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اس معاشرے میں کسی شخص کی دولت اور شان وشوکت کا اندازہ اس کے ریوڑ اور گلے ہی سے کیا جاتا۔ جس کا ریوڑ جتنا بڑا ہوتا اُسے معاشرے میں اتنا ہی بڑا آدمی سمجھا جاتا۔ عرب سماج کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کریم نے چوپاؤں سے متعلقہ اُن منافع کا ذکر کرتے ہوئے جمال اور اظہار شان وشوکت کو بھی ایک منفعت کے طور پر بیان کیا ہے۔ جمال کی تصریح قرآن کریم نے اراحۃ اور سرح سے کی ہے۔ اَب دیکھا جائے تو ترتیب وضعی میں سرح (چوپاؤں کا صبح کے وقت چراگاہ کی طرف جانا) پہلے ہے اور اراحۃ (بوقت شام چراگاہ سے باڑوں کی طرف واپسی) بعد میں ہے لیکن چونکہ اراحۃ میں جمال زیادہ ہے لہذا موقع کلام کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے اراحۃ کو سرح پر مقدم رکھا گیا ہے، جیسا کہ ابن عاشور (م: ۱۳۹۳ھ) لکھتے ہیں:

''وَتَقْدِيمُ الْإِرَاحَةِ عَلَى التَّسْرِيحِ لِأَنَّ الْجَمَالَ عِنْدَ الْإِرَاحَةِ أَقْوَى وَأَبْهَجُ، لِأَنَّهَا تُقْبِلُ حِينَئِذٍ مَلْأَى الْبُطُونِ حَافِلَةَ الضُّرُوعِ مَرِحَةً بِمَسَرَّةِ الشِّبَعِ وَمَحَبَّةِ الرُّجُوعِ إِلَى مَنَازِلِهَا مِنْ مَعَاطِنَ وَمَرَابِضَ.''[16]

''آیت میں اراحۃ کو تسریح سے پہلے لایا گیا ہے کیونکہ اراحۃ کے وقت جمال اور اظہار شان وشوکت سرح کی بانسبت زیادہ ہے کیونکہ شام کو وہ چوپائے اس حال میں لوٹتے ہیں کہ وہ شکم سیر ہوتے ہیں اور مادہ کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں سو وہ جانور شکم سیر اور اپنے باڑوں کی طرف لوٹنے کے سبب خوشی سے مستی کی چال چل رہے ہوتے ہیں''

علامہ آلوسی (۱۲۷۰ھ) فرماتے ہیں:

''وتقديم الإراحة على السرح مع أنها متأخرة في الوجود عنه لكونها أظهر منه في استتباع ما ذكر من الجمال وأتم في استجلاب الانس والبهجة إذ فيها حضور بعد غيبة وإقبال بعد ادبار على أحسن ما يكون ملأى البطون حافلة الضروع.''[17]

''اراحۃ مقدم ہے سرح پر حالانکہ وہ وجود میں متاخر ہے اس کے باوجود اُسے پہلے لایا گیا ہے کیونکہ اس میں جمال کا پہلو نمایاں ہے اور یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ جب چوپائے ایک مدت باہر گزار واپس آتے ہیں تو اُن کا انسانوں سے سامنا ہوتا ہے اس حال میں کہ وہ جانے کے بعد آنا ایسا خوبصورت ہوتا ہے کہ اُن کے پیٹ خوراک اور تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں''

توبیخ

تقدیم وتاخیر کے بلاغی اسباب میں سے ایک سبب توبیخ بھی ہے۔ توبیخ سے مراد متکلم کا مخاطب کی کسی خاص معاملہ پر سرزنش کرنا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[وَجَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ رَجُلٌ يَسْعَى][18]

''اور اتنے میں ایک شخص اُس شہر کے کسی دور مقام سے دوڑتا ہوا آیا''

اِس ترکیب میں ظرف من اقصاء المدینۃ کے اُلفاظ کو فاعل یعنی لفظ رجل سے پہلے لایا گیا ہے جبکہ اصلاً تو ظرف فاعل کے بعد مذکور ہوتی ہے۔ سو یہاں ظرف کو مقدم لانے کا بلاغی سبب توبیخ ہے۔ وہ اِس طرح سے کہ جب ایک شخص اقصاء المدینہ یعنی شہر کے دوسرے کنارے پر ہوتے ہوئے معرفت حق پا سکتا ہے تو وہ اہل بلد جو کہ پیغمبر کے قرب و جوار میں رہنے والے ہیں وہ کیونکر حق سے نابلد ہیں، جیسا کہ علامہ ابن عاشور (م:۱۳۹۳ھ) اِسی بلاغی نکتہ کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" عُبِّرَ عَنْهَا هُنَا بِالْمَدِينَةِ تفننا، فَيكون أَقْصَا صِفَةً لِمَحْذُوفٍ هُوَ الْمُضَافُ فِي الْمَعْنَى إِلَى الْمَدِينَةِ. وَالتَّقْدِيرُ: مِنْ بَعِيدِ الْمَدِينَةِ، أَيْ طَرَفِ الْمَدِينَةِ، وَفَائِدَةُ ذِكْرِ أَنَّهُ جَاءَ مِنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ الْإِشَارَةُ إِلَى أَنَّ الْإِيمَانَ بِاللَّهِ ظَهَرَ فِي أَهْلِ رَبَضِ الْمَدِينَةِ قَبْلَ ظُهُورِهِ فِي قَلْبِ الْمَدِينَةِ لِأَنَّ قَلْبَ الْمَدِينَةِ هُوَ مَسْكَنُ حُكَّامِهَا وَأَحْبَارِ الْيَهُودِ وَهُمْ أَبْعَدُ عَنِ الْإِنْصَافِ وَالنَّظَرِ فِي صِحَّةِ مَا يَدعُوهُم إِلَيْهِ الرُّسُلُ، وَعَامَّةُ سُكَّانِهَا تَبَعٌ لِعُظَمَائِهَا لِتَعَلُّقِهِمْ بِهِمْ وَخَشْيَتِهِمْ بَأْسَهُمْ بِخِلَافِ سُكَّانِ أَطْرَافِ الْمَدِينَةِ فَهُمْ أَقْرَبُ إِلَى الِاسْتِقْلَالِ بِالنَّظَرِ وَقِلَّةِ اكْتِرَاثٍ بِالْآخَرِينَ لِأَن سكان الْأَطْرَاف غَالِبُهُمْ عَمَلَةُ أَنْفُسِهِمْ لِقُرْبِهِمْ مِنَ الْبَدْوِ."[19]

''اس میں اہل مدینہ کو بڑے لطیف انداز میں عبرت دلائی گی ہے، پس لفظ اقصا محذوف کی صفت ہے جو کہ معنا مضاف ہے مدینہ کی طرف، تقدیر عبارت من بعید المدینۃ کی صورت میں ہو گی یعنی شہر کے کنارے سے۔ اقصا کے کلمہ کو ترکیب کا حصہ بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ شہر کے کناروں پر رہنے والے تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان لے آئے ہیں جبکہ اس کے وسط میں رہنے والے اس نعمت سے ابھی تک محروم ہیں، ایسا اس لیے ہے کہ وسط مدینہ میں رہنے والا طبقہ اس کے حکام اور احبار یہود پر مشتمل ہے اور یہ لوگ انصاف اور درست فکر سے محروم ہیں کہ یہ رسولوں کی دعوت پر کان دھریں، البتہ جہاں تک باقی ماندہ باسیوں کا تعلق ہے تو وہ تعلق داری اور حکام بالا کے شر سے بچنے کے لیے اپنے بڑوں کی متابعت اختیار کیے ہوئے ہیں اور جہاں تک اطراف مدینہ میں رہنے والوں کا تعلق ہے تو بدوی سماج سے قربت کے سبب اُن کا درجہ بالا لوگوں سے واسطہ کم ہی رہتا ہے سو وہ اپنی ذات پر ہی انحصار کرتے ہیں اور مستقل مزاج ہوتے ہیں۔''

پس مذکورہ آیت میں اُن منکرین و معرضین کے لیے سرزنش اور تنبیہ کا سامان ہے کہ جو مکانی قرب رکھنے کے باوجود بھی قبولیت حق سے محروم ہیں۔ سرزنش اور توبیخ کے یہ معنیٰ اس ترکیب سے تبھی پیدا ہوئے کہ جب ظرف کو فاعل سے پہلے ذکر کیا گیا، کیونکہ اس کے برعکس اگر اس جملہ کو اپنے عمومی بہاؤ میں ہی رکھا جاتا تو اُس سے یہ مفہوم اَخذ نہیں ہو سکتا تھا۔

قلوب واذہان کو متوجہ کرنے کے لیے

قرآن کریم بسا اوقات مخاطبین کی توجہ کو کسی خاص اَمر کی طرف ملتفت کرنے کے لیے بعض مواقع پر ترکیب میں تحول ترکیب کلمات کے اُسلوب کو اپناتا ہے۔ جیسا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ جن وغیرھم کی شراکت داری جیسے باطل عقدے کو رد کرتے ہوئے قرآن بیان کرتا ہے۔

[وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ][20]

''اور لوگوں نے اللہ کا شریک جنات کو قرار دے رکھا ہے''

ترکیب میں مذکور لفظ الجن مفعول اول جبکہ شرکاء مفعول بہ ثانی اور للہ جار ومجرور مفعول ثانی سے متعلق ہے ،لہذا تقدیر عبارت کچھ اس طرح سے ہے؛ وجعلوا الجن شرکاء للہ۔ شیخ طنطاوی (م:۱۴۳۱ھ) لکھتے ہیں:

"وقال- سبحانه- وَجَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ الْجِنَّ ولم يقل: وجعلوا الجن شركاء لله. لإفادة أن محل الغرابة والنكارة أن يكون لله شركاء. ولو قال وجعلوا الجن شركاء لله لأوهم أن موضع الإنكار أن يكون الجن شركاء لله لكونهم جنا. وليس الأمر كذلك، بل المنكر أن يكون لله شريك من أى جنس كان."[21]

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے وجعلوا الجن شرکاءللہ کی بجائے وجعلوا للہ شرکاءالجن فرمایا ہے۔ایسا کرنے کی وجہ شراکت باللہ کی کراہت وشناعت کو واضح کرنا ہے۔اس لیے کہ اگر ترکیب جعلوا الجن للہ شرکاء کی صورت میں مذکور ہوتی تو اس شکل میں یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ یہاں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جنات کی شراکت داری سے منع کیا گیا ہے جبکہ معاملہ ایسے نہیں ہے کیونکہ ممانعت تو مطلقاً شراکت باللہ سے ہے"

تو گویا نظم کلام میں تقدیم وتاخیر سے ایک زائد معنٰی حاصل ہوا جو کہ اس جملہ کی مذکورہ بالا ترتیب کے بغیر ممکن نہ تھا اور وہ معنٰی مطلقاً شرک کی مذمت اور شناعت کے ہیں۔اس لیے کہ اگر الفاظ کو اپنے محل پر رکھا جاتا تو اس سے محض جنات کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے کی ممانعت کو ہی سمجھا جا سکتا تھا۔

اختصاص

مؤخر کو مقدم لانے سے عمومی طور پر کلام میں تخصیص کے معنٰی پیدا ہو جاتے ہیں۔اِس اختصاص کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مخاطب تعیین کی غلطی سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ مخصوص طریقے سے خاص کر دیا جاتا ہے۔جیسا کہ قرآن کریم میں وارد ہے:

[إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ][22]

"ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں"

آیت میں ضمیر منفصل جو کہ مفعول واقع ہے اور ترتیب جملہ میں فعل سے پہلے وارد ہے۔ترکیب میں مفعول کی فعل پر یہ تقدیم تخصیص کا فائدہ دے رہی ہے یعنی ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف آپ ہی سے مدد کے طلب گار ہیں۔ علامہ زمخشری(م:۵۳۸ھ) رقمطراز ہیں:

"وتقديم المفعول لقصد الاختصاص، كقوله تعالى:[قُلْ أَفَغَيْرَ اللَّهِ تَأْمُرُونِّي أَعْبُدُ][23]،[قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا][24]والمعنى نخصك بالعبادة، ونخصك بطلب المعونة."[25]

''مفعول کو معنٰی میں تخصیص پیدا کرنے کے لیے مقدم کیا گیا ہے جیسا کہ ارشار باری ہے (آپ کہہ دیں کہ کیا تم مجھے غیر اللہ کی پرستش کا کہتے ہو)،(آپ کہو کہ کیا میں خدا کے علاوہ کوئی اور پروردگار تلاش کروں) معنی یہ ہیں کہ ہم خاص آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں''

معنوی خلل کو دور کرنے کے لیے

بیان معنٰی میں خلل کو دور کرنے کے لیے بھی ترکیب میں تقدیم وتاخیر کے اُسلوب کو اختیار کر لیا جاتا ہے۔اس کی مثال اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد ہے:

[وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ][26]

''اور کہا ایک مرد نے جو خاندان فرعون سے تھے اور اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھے''

آیت میں مذکور کلمہ رجل کی تین صفات بیان ہوئی ہیں، پہلی صفت مؤمن ،دوسری صفت من آل فرعون اور تیسری صفت یکتم ایمانیه ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ صفت مفرد پہلے پھر صفت جملہ اور پھر صفت شبہ جملہ آتی ہے۔ لیکن مذکورہ بالا نظم میں صفت جملہ پر شبہ جملہ کو مقدم لایا گیا ہے تاکہ یہ وہم پیدا نہ ہو کہ یہ یکتم (فعل مضارع) کا صلہ ہے کیونکہ اس صورت میں رجل مؤمن کے آل فرعون سے کتمان ایمان کا معنٰی تو مل جاتا لیکن اُس کا فرعونی النسل (قبطی ہونا) ثابت نہ ہوتا۔ جیسا کہ ایک قول رجل مؤمن کے اسرائیلی ہونے کے حوالے سے منقول ہے۔ جملہ سے یہ مفہوم اِسی صورت میں اَخذ ہو سکتا ہے کہ جب من آل فرعون کو یکتم کا صلہ قرار دیا جائے، جبکہ دوسری طرف معروف قول یہی ہے کہ وہ مؤمن شخص خاندان فرعون سے تعلق رکھتا تھا۔ سیاق کلام بھی اِسی مفہوم کی تائید کرتا ہے ،جیسا کہ علامہ نسفی (م:۷۱۰ھ) لکھتے ہیں:

" قيل كان قبطياً ابن عم لفرعون امن بموسى سرا ومن ال فرعون صفة لرجل وقيل كان اسرائيليا من آل فرعون صلة ليكتم أي يكتم إيمانه من آل فرعون."[27]

''ایک قول یہ ہے کہ وہ قبطی النسل اور فرعون کا چچازاد تھا جو کہ موسیٰؑ پر خفیہ سے ایمان لے آیا تھا اس صورت میں من آل فرعون کلمہ رجل کی صفت بنے گی،اور ایک قول یہ ہے کہ وہ اسرائیلی تھا تو

اِس صورت میں آل فرعون، یکتم کے لیے صلہ ہو گا، یعنی وہ اپنے ایمان کو آل فرعون سے چھپائے ہوئے تھا"

حصول برکت کے لیے

بسااوقات حصول برکت کے لیے کسی لفظ کو اُس کی اصلی نشست سے اٹھا کر پہلے ذکر کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

الف: [اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ][28]

"اللہ تعالیٰ نے بہترین کلام نازل کیا ہے ایک کتاب باہم ملتی جلتی اور بار بار دہرائی ہوئی"

یہ کتاب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ ہے اور اس کی خوبیوں اور اعجازی وجوہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس کے مضامین میں مشابہت ہے اور اس کے بیان کردہ احکام و قصص تکرار کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کریم کی تعریف پر مشتمل اِس جملہ میں اسم جلیل پہلے مذکور ہے اور اس تقدیم کا بلاغی سبب حصول برکت ہے۔ جیسا کہ امام سیوطی (م:۹۱۱ھ) فرماتے ہیں:

" التَّبَرُّكُ كَتَقْدِيمِ اسْمِ اللَّهِ تَعَالَى فِي الْأُمُورِ ذَاتِ الشَّأْنِ "[29]

"حصول برکت کے لیے کسی لفظ کو مقدم ذکر کر دینا جیسا کہ شاندار اُمور میں اللہ تعالیٰ کے نام کو پہلے لے آنا"

اہمیت

اہل عرب کے ہاں کسی اُمر کی اہمیت واہتمام کو بیان کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ اُسے ترتیب کلام میں پہلے لے آتے تھے، جس سے مخاطب پر اُس اُمر کا مہتم بالشان ہونا واضح ہو جاتا تھا۔ عربوں کے اس اُسلوب بیان کی وضاحت کرتے ہوئے امام سیبویہ (م:۱۸۰ھ) لکھتے ہیں:

"كانهم يقدمون الذى شأنه أهم لهم وهم ببيانه أعنى ، وان كان جميعا يهمانهم ويعنيانهم"[30]

اہل لسان کی اس مروجہ طرز کو قرآن کریم نے بھی متعدد بار استعمال کیا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

الف: [وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ][31]

''نماز قائم کرواور زکوٰۃ ادا کیا کرو

ترتیب کلام میں نماز کے ذکر کو پہلے لانا اُس کی اہمیت اور فضیلت کو بیان کر رہا ہے۔

" فبدأ بالصلوة لانها أهم"[32]

''پس نماز کو پہلے ذکر کیا کیونکہ وہ زیادہ اہم ہے''

ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی

بسااوقات کلمات جملہ کو ذکر کرتے وقت ارتقاء کے فطری تقاضوں کے مطابق نیچے سے اوپر کی طرف جایا جاتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

[وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا][33]

''اور اس کتاب میں ابراھیم کا قصہ بیان کرو، بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھے''

آیت میں مذکور لفظ صدیق کے معنیٰ سچ بات کہنے، اپنی کہی ہوئی بات کو عمل سے سچ کر دکھانے اور سچائی قبول کرنے کی اعلیٰ قلبی استعداد کے پائے جانے کے ہیں۔

"الصديق الكثير الصدق القائم عليه"[34]

البتہ جہاں تک ابراہیمؑ کے لیے لفظ صدیق کے استعمال کا تعلق ہے تو وہ صدیق کے ہر مفہوم کے لحاظ سے صدیقیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ لیکن صدیقیت چونکہ نبوت کی بانسبت عام ہے، اِس لیے کہ صدیق کے لیے نبوت لازم نہیں جبکہ نبوت کے لیے صدیقیت لازم ہے۔ پس یہاں ترکیب میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف بہاؤ کا اُسلوب اپنایا گیا ہے۔ چنانچہ پہلے عام لفظ یعنی صدیق کو ذکر کیا گیا اور پھر خاص یعنی لفظ نبی کو لایا گیا۔

خلاصہ

عربی زبان کی خصوصیات وامتیازات کا ایک اہم پہلو کلام کے الفاظ میں تقدیم وتاخیر کا اُسلوب بھی ہے۔ تقدیم و تاخیر کی اس طرز سے مراد کلام کے الفاظ کو ایسی ترتیب کے ساتھ ذکر کرنا ہے جو کہ متداول اور معروف ترتیب سے ہٹ کر ہو۔ عربی زبان میں چونکہ دیگر السنہ کے برعکس یہ وسعت غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے کہ اس میں الفاظ کی ترکیبی و ترتیبی نشست کو متکلم حسب منشاء تشکیل دے سکتا ہے۔ وہ کلام میں جس اُمر کو ضروری اور اہم خیال کرتا ہے اُسے حسب

موقع ترتیب کلام میں مقدم و مؤخر کر سکتا ہے۔ البتہ اُسے بطور جز جملہ کسی بھی رکن و عنصر کو کسی بھی ترکیبی محل میں رکھنے کے لیے بہر حال اُن قیاسی قواعد کا احتیاج رہتا ہے جو کہ اہل نحو کی صدیوں کی ریاضت کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں۔ اَب یہ قواعد دو طرح کے ہیں، اِن میں سے کچھ وجوبی اور کچھ جوازی کہلاتے ہیں۔ جہاں تک وجوبی قواعد کا تعلق ہے تو اُن کا التزام بہر صورت ضروری ہوتا ہے، جیسا کہ اہل عرب[35] جملہ فعلیہ کے رکن کے طور پر فاعل کو فعل سے مقدم نہیں لاتے، سو یہ لسانی اصول بہر صورت قائم رہے گا اور اِس کا خلاف کسی صورت جائز نہیں ہو گا۔ جبکہ اِس کے برعکس جہاں تک جملہ فعلیہ کے تیسرے رکن یعنی مفعول کا تعلق ہے تو اہل لسان حسب ضرورت اسے نہ صرف فاعل پر مقدم کر دیتے ہیں بلکہ بسا اوقات اُسے فعل سے بھی پہلے لے آتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں بہر حال متکلم کے پاس یہ گنجائش موجود رہتی ہے کہ وہ ترتیب کے ان جوازی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا یہ اختیار استعمال کر سکتا ہے۔ اَب یہ اَمر بھی اظہر من الشمس ہے کہ ایک مألوف ترتیب کو ترک کرتے ہوئے غیر معروف ترتیب کی طرف جانا اگر معنوی اور بلاغی غرض کے بغیر ہے تو یہ تکلف محض ہو گا۔ جس سے نہ صرف لفظی اعتبار سے زبان کا حسن خراب ہو گا بلکہ معنوی لحاظ سے بھی اُس میں مشکل اور پیچیدگی پیدا ہو جائے گی۔ جبکہ اس کے برعکس اگر مألوف ترتیب سے عدول کا یہ عمل کسی بلاغی فائدہ اور حکمت سے جڑا ہوا ہو گا تو یہ متکلم و سامع دونوں کے لیے فوائد و حِکم کا غیر معمولی نمونہ ہو گا۔ متکلم جہاں اس طرز کو اپناتے ہوئے کسی بھی خاص معنٰی کو کلام میں الفاظ کا اضافہ کیے بغیر محض تحویل ترتیب سے مخاطب تک پہنچا سکتا ہے۔ تو دوسری طرف مخاطب مألوف ترتیب کے برعکس ایک خاص ترتیب کو دیکھتے ہی متکلم کے مدعا و مقصود اور زور بیان کا اندازہ کر سکتا ہے۔

قرآن کریم نے بھی اہل عرب کے ہاں مروج اس لسانی اُسلوب کا موقع بموقع استعمال کیا ہے۔ مذکورہ منہج پر مبنی قرآنی تراکیب جہاں مختلف طبقات اہل علم کی دلچسپی کا موضوع رہی ہیں وہاں خاص طور پر اہل بلاغت کی توجہ و رغبت کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ علماء بلاغت نے اِن تراکیب کو اپنا موضوع بناتے ہوئے اپنی اپنی بساط کے مطابق اِن کے پس منظر میں پنہاں اُن اَسرار و حکم کو جاننے کی کوشش کی ہے کہ جن کی بابت قرآن کریم نے اِس خاص طرز و اُسلوب کو اختیار کیا ہے۔ قرآن کریم کا اِس طرز کلام کو اختیار کرنا جہاں اہل لسان کے ہاں مروج اِس منہج کی غیر معمولی افادیت کو ظاہر کرتا ہے وہاں یہ اہل زبان کے لیے تحدی کا سامان بھی رکھتا ہے۔ وہ اس طرح سے کہ کہ یہ اُسلوب بنیادی طور پر اہل لغت کا ترویج

کردہ ہے مگر قرآن حکیم جہاں جہاں اس طرز کو اپناتا ہے تو وہ ترکیب کے ظاہری و باطنی حسن و کمال کا ایسا مرقع بن جاتی ہے کہ عربی اُدب کی کوئی اور ترکیب اس کی مثل اور نظیر نہیں ہو سکتی۔

قرآن حکیم میں مستعمل تقدیم وتاخیر کی طرز پر مشتمل تراکیب کے فوائد و حِکم کو اگر مجموعی حوالے سے دیکھا جائے تو یہ معلوم پڑتا ہے کہ بعض مواقع پر اس طرز کو اپنانے کا مقصد دو طرفہ فوائد کا حصول ہوتا ہے، یعنی ایک طرف جہاں کلام کی سجع بندی کو قائم رکھا گیا ہے تو دوسری طرف اُس سے کسی خاص معنٰی کا حصول بھی مقصود ہے۔ جبکہ بعض مواقع پر اِس اُسلوب کو اختیار کرنے کا داعیہ صرف لفظی حوالے سے کلام کی موزونیت کو برقرار رکھنا ہوتا ہے یا پھر کسی خاص معنٰی پر دلالت مقصود ہوتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

[1]۔القرآن،البقرۃ،۲:۲۵۵

[2]۔پانی پتی، قاضی محمد ثناءاللہ(م:۱۲۲۵ھ)، تفسیر مظہری،مکتبۃ الرشیدیۃ،پاکستان،۱۴۱۲ھ،۱/۳۵۸

[3]۔القرآن،الاعلیٰ،۸۷:۱۹

[4]۔ابن عاشور، محمد طاہر بن محمد(م:۱۳۹۳ھ)،التحریر والتنویر،الدار التونسیۃ للنشر،تونس،۱۹۸۴ء،۲۷/۱۳۰

[5]۔القرآن،البقرۃ،۲:۱۵۸

[6]۔الجصاص،أحمد بن علی ابو بکر الرازی(م:۳۷۰ھ)،احکام القرآن، محقق: محمد صادق القمحاوی،داراحیاءالتراث العربی،بیروت ،لبنان،۱۴۰۵ھ،۱/۱۲۳

[7]۔القرآن،النساء،۴:۳

[8]۔القرآن،التوبۃ،۹:۴۳

[9]۔تفسیر مظہری،۴/۲۲۲

[10]۔القرآن،البقرۃ،۲:۷۹

[11]۔القاسمی، محمد جمال الدین بن محمد سعید الحلاق، محاسن التاویل، محقق: محمد باسل عیون،دارالکتب العلمیۃ،بیروت،۱۴۱۸ھ،۱/۳۳۹

[12]۔القرآن،طہ،۲۰: ۶۶، ۶۷، ۶۸

[13]۔الزرکشی،بدرالدین محمد بن عبداللہ (م: ۷۹۴ھ)،البرهان فی علوم القرآن،دارالمعرفۃ،بیروت، لبنان،۱۹۵۷ء،۶۲/۱

[14]۔القرآن،ابراھیم،۱۴: ۵۰، ۵۱

[15]۔القرآن،النحل،۱۶: ۶

[16]۔التحریر والتنویر،۱۰۵/۱۴

[17]۔آلوسی، محمود بن عبداللہ الحسینی (م: ۱۲۷۰)،روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، محقق: علی عبدالباری عطیۃ،دار الکتب العلمیۃ،بیروت، لبنان،۱۴۱۵ھ،۳۴۳/۷

[18]۔القرآن،یٰسین،۳۶: ۲۰

[19]۔التحریر والتنویر،۳۶۵/۲۲

[20]۔القرآن،الانعام،۶: ۱۰۰

[21]۔طنطاوی، محمد سید (م: ۱۴۳۱ھ)،التفسیر الوسیط للقرآن الکریم،دار نھضۃ، قاھرۃ، مصر،۱۹۹۷ء،۱۴۵/۵

[22]۔القرآن،الفاتحہ،۱: ۵

[23]۔القرآن،الزمر،۳۹: ۶۴

[24]۔القرآن،الانعام،۶: ۱۶۴

[25]۔الزمخشری، محمود بن عمرو (م: ۵۳۸ھ)،الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل،دارالکتاب العربی،بیروت، لبنان،۱۴۰۷ھ،۱۳/۱

[26]۔القرآن،غافر،۴۰: ۲۸

[27]۔النسفی،ابوالبرکات عبداللہ بن أحمد (م: ۷۱۰ھ)، مدارک التنزیل وحقائق التأویل، محقق: یوسف علی بدیوی،دار الکلم الطیب ،بیروت، لبنان،۱۴۱۹ھ،۲۰۸/۳

[28]۔القرآن،الزمر،۳۹: ۲۳

[29]۔السیوطی،عبدالرحمن بن ابی بکر (م: ۹۱۱ھ)،الاتقان فی علوم القرآن، محقق: محمد ابوالفضل ابراہیم،الھیۃ المصریۃ،۱۳۹۴ھ،۴۰/۳

[30]۔سیبویہ، عمرو بن عثمان الحارثی (م: ۱۸۰ھ)، الکتاب، محقق: عبدالسلام محمد ہارون، مکتبہ الخانجی، القاہرۃ، مصر، ۱۴۰۸ھ، ۱/۳۴

[31]۔القرآن، البقرۃ، ۲: ۴۳

[32]۔الزرکشی، بدرالدین محمد بن عبداللہ (م: ۷۹۴ھ)، البرھان فی علوم القرآن، محقق: ابوالفضل الدمیاطی، دارالحدیث ،القاہرۃ، مصر، ۱۴۲۷ھ، ص ۷۷۲

[33]۔القرآن، مریم، ۱۹: ۴۱

[34]۔البغوی، عبداللہ بن أحمد (م: ۱۱۲۲ھ)، معالم التنزیل، دارالسلام للنشر، ریاض، سعودیۃ، ۱۴۱۶ھ، ۴/۵۶۹